راکھ

زیر اہتمام : پریم گوپال متل
انتخاب و ترتیب : ایم اسلم انصاری (علیگ)
قیمت : چھ روپے
تعدادِ اشاعت : پانچ سو
مطبع : سوورپریس، دہلی

راکھ

احتشام اختر

ناشر

پی۔ کے۔ پبلیکیشنز

۳۰۷۲ پرتاپ اسٹریٹ۔ گولا مارکیٹ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

(غالب)

اپنے ماموں

پیرزادہ سید علیم الدین علیمی کے نام

غزل

دشوار ہے بھُلانا مزہ اضطراب کا
منظر ابھی بھی یاد ہے مرگِ عقاب کا

پھاڑا مجھے تو سلسلہ پھر ٹوٹ جائے گا
میں بھی تو اک ورق ہوں تمہاری کتاب کا

لکھتا ہوں اس کا نام میں گھر میں جگہ جگہ
باقی ابھی خمار ہے کل کی شراب کا

میری صدا ہی گونجتی رہتی ہے دشت میں
میں منتظر ہوں اپنی صدا کے جواب کا

دیکھا تھا جس کو جھیل کے درپن میں ایک دن
آنکھوں کو انتظار ہے اس ماہتاب کا

خوشبو نے سُرخ پھول کی پاگل کیا مجھے
آنگن سے کاٹ پھینکا ہے پودا گلاب کا

استغنا

تھکن پیروں سے لپٹی ہے
نگاہوں میں اداسی ہے
یقیں کی کوکھ سے پھر جنم لیتے ہیں
کئی خدشے
پھٹے کاغذ کی تحریریں
بکھر جائیں گی نالی میں
میں چاہوں تو سمندر جیب میں بھر لوں
مگر مجھکو سمندر کی ضرورت کیا
مجھے کیچڑ سے کیا لینا
مجھے مٹی سے کیا مطلب
مجھے کڑوے نشیلے پانیوں سے
سخت نفرت ہے

غزل

میرے ہی بدن کے لیے تلوار بھی ہو گی
یہ ٹھنڈی ہوا باعثِ آزار بھی ہو گی

گونجی تھی جو آواز مری دشت میں اک دن
معلوم کسے تھا کہ گرفتار بھی ہو گی

بستی سے بہت دور بیاباں میں کبھی موت
یاروں کے لیے سرخیٔ اخبار بھی ہو گی

جس چیز کو چوروں کی طرح دیکھ رہے ہو
گر جائے گی ہاتھوں سے تو جھنکار بھی ہو گی

چلتے رہو یوں ہی کہ یہ پتھریلی گزرگاہ
قدموں سے ہمارے کبھی ہموار بھی ہو گی

آسان سمجھ کر جسے گزرے ہیں کئی بار
معلوم نہ تھا راہ وہ دشوار بھی ہو گی

سوچا ہی نہ تھا اس دلِ نافہم نے اخترؔ
پھینکے گا اگر تیر تو یلغار بھی ہو گی

روشنی دفنانے سے پہلے

جھیل سی
نیلی آنکھوں کا ہر خواب مر جائے گا
چھپکلی کی طرح یوں
چپکنے سے دیوار پر
کیا ملے گا مجھے
کوئی جادہ نہیں، کوئی منزل نہیں
میں کسی کا نہیں کوئی میرا نہیں
اب ہواؤں کے ساتھ پر کہاں جائیں گے
جیب میں
میں نے بھر لی تھی کل روشنی
آج اس کو بھی دفنا ہی دوں گا کہیں

ارادہ

بلڈنگوں کی اونچائی
زنگ بن کے بکھری ہے
سُرمئی اندھیرے نے
راستے کو گھیرا ہے
ہر دِشا بھیانک ہے
کس دِشا کو جائیں گے
آج میں نے سوچا ہے
کاغذی اصولوں کو
جیب سے نکالوں گا
اور پھاڑ ڈالوں گا

غزل

اپنے اعزاز و تجمل میں نہ کمتر ہوتا
میں اگر دشت نہ ہوتا تو سمندر ہوتا

میں خلاؤں کی بلندی سے بھی واپس آیا
میری آنکھوں میں کوئی دور کا منظر ہوتا

منزلیں دور ہیں کتنی یہ خبر ہی دیتا
میں کہ جامد ہی سہی میل کا پتھر ہوتا

مجھکو خود اپنے ہی لوگوں نے جلانا چاہا
جل ہی جاتا میں اگر جسم کے اندر ہوتا

دامنِ کوہ سے نکلا ہوا دریا اخترؔ
ریگزاروں میں نہ پھنستا تو سمندر ہوتا

غزل

ورق ورق یہ فسانہ بکھرنے والا تھا
بچا لیا مجھے اس نے میں مرنے والا تھا

شگفتہ پھول پریشاں ہوا تو غم نہ کرو
کہ وہ تو یوں بھی ہوا میں بکھرنے والا تھا

میں اس کو دیکھ کے پھر کچھ نہ دیکھ پاؤں گا
یہ حادثہ بھی مجھی پر گزرنے والا تھا

پہاڑ سینہ سپر ہو گیا تھا میرے لیے
وگرنہ مجھ میں سمندر اترنے والا تھا

میں بے قصور ہوں یہ فیصلہ ہوا، ورنہ
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

اُمڈ پڑا تھا جو سیلابِ ہجرِ تنہائی
وہ شہرِ دل کو بھی غرقاب کرنے والا تھا

غزل

اپنی ہی دھن میں بہتے رہے ایک دن
چھوٹے چھوٹے سے دریا سمندر ہوئے
نام لیکے پکارا کسی نے ہمیں
ہم نے دیکھا جو مڑ کے تو پتھر ہوئے
زیب و زینت تھے کمرے کی جو کل تلک
آج بیکار وہ سب کلینڈر ہوئے
آرزو تھی کھلیں اور پھر ایک دن
برف کے پھول افسردہ کھل کر ہوئے
برف تو تھا مگر میں نہ پگھلا کبھی
گرچہ سورج کے حملے برابر ہوئے

تعمیرِ نو

موت کے اندھیرے میں اک دیا جلاتا ہوں
منہدم عمارت کو پھر سے میں بناتا ہوں
دل کے اِن خرابوں کو پھر سے میں سجاتا ہوں

زلزلے تو آتے ہیں، زلزلے تو آئیں گے
پھر زمین کانپے گی پھر مکان اُجڑیں گے
زلزلے مقدر ہیں وادیِ محبت کا

زلزلے تو آتے ہیں زلزلے تو آئیں گے

اجنبی شہر

شام کی ڈھلتی دھوپ کے سائے
چکنی چوڑی
فٹ پاتھوں پر
اونگھ رہے ہیں
میری آس کی ماری آنکھیں
ہوٹل کی کھڑکی سے باہر
دور سڑک پر
اب بھی اس کو
ڈھونڈ رہی ہیں
رات کے ساڑھے آٹھ بجے تک
شہر کی ساری رنگ رلیوں کو

چھوڑ کے مجھکو چل دینا ہے
چھوڑو سب بیکار سی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے
لاؤ انڈ یلو
جام میں وہسکی
خوب پیو اور خوب پلاؤ

غزل

کبھی نشیب میں تھا اور کبھی فراز میں تھا
یہ آبشارِ محبت دلوں کے راز میں تھا

مرے خلاف ہی سازش وہ کر رہے تھے مگر
عجیب بات ہے شامل میں ساز باز میں تھا

تمہیں خبر ہی نہیں اس کی جستجو کہ کبھی
مری صدا کا فسوں بھی ہر ایک جاز میں تھا

تمام عمر میں بے گھر رہا خبر نہ ہوئی
کہ میرا گھر اسی چشمِ فسوں طراز میں تھا

میں اب نہ قید لکیروں میں ہوں نہ رنگوں میں
ہزار پہلے مقید میں دام آز میں تھا

زمیں پہ گر کے یکایک جو پاش پاش ہوا
تمہیں خبر ہی نہیں میں اسی جہاز میں تھا

غزل

گو اس کی شکل اب ہے کہن سال کی طرح
بھولا نہیں میں گاؤں کی چوپال کی طرح

صحرائے حرص و آز میں کوئی تو آئے گا
پھیلاؤں اپنے آپ کو میں جال کی طرح

اندر کا رس نچوڑا تو شاداب تھا بہت
لگتا تھا یوں تو سوکھی ہوئی ڈال کی طرح

مجھ سے کہاں بچے گا کہ ہر رگ میں ہوں نہاں
پھیلا ہوں تیرے جسم میں میں جال کی طرح

کب سے ہے انتظار کہ آئے کوئی ادھر
میں دشت میں ہوں جادۂ پامال کی طرح

ایک مرثیہ

(اپنی بہن کے انتقال پر)

شفیق آنکھیں
کہ جن میں میرا ہی عکس اب تک
بسا ہوا تھا
شفیق آنکھیں
کہ دیکھتی تھیں
مری جوانی مرے بڑھاپے کے خواب ہر دم
شفیق آنکھیں کہ جن میں اخترؔ
بسا ہوا تھا
وہ کل — کہ اب جو گزر گیا ہے
وہ کل — کہ جو آنے والا ہے اب
وہ آنکھیں دریا کی تھیں روانی
وہ آنکھیں جھیلوں کی تازگی تھیں

وہ آنکھیں اب کیوں بنی ہیں پتھر
اداس جھیلوں کی سبز کائی کبھی مر نہ جائے
کہ قطرہ قطرہ
ٹپکتی شبنم تو ریگ زاروں میں کھو گئی ہے
حدیں نہ کھینچو ردمال سے تم
کہ میری آنکھیں ندی بنی ہیں
عزیزو مجھ پر کرم یہ کر دو
شفیق آنکھوں میں نور بھر دو

لمبی قبریں

نیل گگن پہ
کالا دھواں پھر
پھیل گیا ہے
جھیل میں کوئی عکس نہیں ہے
دھوپ نہیں اب آتی گھر میں
چاند اور سورج قتل ہوئے ہیں
امن کی باتیں کرنے والے
اپنے گھر کے آنگن میں پھر
لمبی قبریں کھود رہے ہیں
آنے والے کل کی میّت
اور خود اپنے خون کا رشتہ
دفن کریں گے

غزل

کبھی زمیں پہ کبھی نیلے آسمان میں ہوں
ہوا کی طرح میں ہر پل نئے مکان میں ہوں

ترا وقار تو میرے ہی دم سے قایم ہے
میں مثلِ آبِ گہر تیری آن بان میں ہوں

لبوں سے اس کے نکل کر ہوا ہوں آوارہ
میں ایک لفظ ہوں ہر دم نئی اڑان میں ہوں

مجھے تو گہرے سمندر سے جا کے ملنا ہے
ابھی میں رک نہیں سکتا ابھی ڈھلان میں ہوں

سمجھ تو مجھکو ذرا میری قدر کر ناداں
میں آسمانی صحیفہ تری زبان میں ہوں

مرے حصار میں تھی ساری کائنات کبھی
ستم ہے قید میں خود اپنے ہی مکان میں ہوں

اگر ہے شوق تو مجھکو خرید لے آکر
کہ میں تو شہرِ ہوس کی ہر اک دکان میں ہوں

غزل

محبت کے گھنے بن میں اندھیرا جال پھیلائے
کوئی بھٹکا مسافر سوچتا ہے کس طرف جائے
گگن پر دل کے چھائے ہیں تمہاری چاہ کے بادل
خوشی کے شہر میں ایسا نہ ہو پھر باڑھ آجائے
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں زندگی کے ماں بھرے سپنے
حقیقت سے کوئی کہدے کہ اپنا روپ دکھلائے
جلا کر دل کے مندر میں نئی آشا کا اک دیپک
پجارن دیوتا کے سامنے رہ رہ کے مسکائے
نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں آنسو آگئے اختر
کسی معصوم کوئل نے مرے جب گیت کل گائے

دوری

دھول اڑتی ہے خیالوں کی گزرگاہوں میں
ریل کی پٹریاں پھیلی ہیں جہاں تک بھی نظر جاتی
دورِ حاضر نے مسافت کا بھرم توڑ دیا
فاصلے راہ کے دیوار کی مانند نہیں
اب کوئی خار بھی تلوار کی مانند نہیں
پھر بھی ہم دور بہت دور رہے ہیں اب تک

Sunny کی ایک دوپہر

یاد جلنے لگی سگرٹ کی طرح
"ایسپریسو" میں گھلی ہے
میری آنکھوں کی تھکن
دھوپ اندر تو نہیں آئے گی
بھاری پردے اسے آنے ہی نہ دیں گے اندر
روشنی گو کہ بہت مدھم ہے
پھر بھی ہاتھوں کی لکیریں تو میں پڑھ سکتا ہوں
بات سرگوشی میں کرتے ہیں جو بیٹھے ہیں یہاں
دھیمی میوزک انھیں مخمور کیے دیتی ہے
راکھ دانی میں بجھا دی ہے گو سگریٹ مگر
اس کی باتوں کا دھواں ہے اب بھی
میرا احساس تپاں ہے اب بھی
لمحہ لمحہ میں اداسی کو پیے جاؤں گا

غزل

دھوپ میں جل کر راکھ ہوا ہوں
جب بھی پیڑ سے میں ٹوٹا ہوں

بیگانوں کے دلیش میں کوئی
اپنے جیسا ڈھونڈ رہا ہوں

دریا ہی میں گھر ہے میرا
پھر بھی دریا سے ڈرتا ہوں

اپنے ذہن کی تحریروں کو
دیمک بن کر چاٹ رہا ہوں

مجھکو لے کر پچھتاؤ گے
میں تو اک کھوٹا سکّہ ہوں

غزل

طوفانی صداؤں سے کمروں کو سجائیں گے
دریا کے کنارے ہم گھر اپنا بنائیں گے

تم وقت کی لہروں میں ایسا نہ ہو کھو جاؤ
موسم کی طرح ہم تو ہر سال ہی آئیں گے

اب دل کے بہلنے کی بس ایک ہی صورت ہے
مٹی کے گھروندوں کو توڑیں گے بنائیں گے

حاصل تو نہ ہوگا کچھ لیکن یہی سوچا ہے
ہم اپنی نگاہوں میں کچھ خواب بسائیں گے

ہم رنگ کے قیدی ہیں وہ رنگ کے موجد ہیں
جس شکل میں چاہیں گے وہ ہمکو بنائیں گے

ہم کھل کے بیاباں میں چھپتائے تو تھے لیکن
معلوم کسے تھا وہ جوڑے میں لگائیں گے

سعیِ رائگاں

گھٹی گھٹی سی تھی فضا
سڑک بھی کچھ خموش تھی
اندھیرا پھیلنے لگا تھا ہر طرف
گھروں سے جھانکنے لگی تھیں یوں

اداسیاں
کہ جیسے کوئی مر گیا ہو راہ میں
تھکن سے ٹوٹتا ہوا بدن
پکارتا تھا نیند کو
نظر کی پیاس بڑھ رہی تھی دمبدم
کسی حسین خواب کا یقیں

کبھی کا مر چکا تھا میرے ذہن میں
گماں کی دھول اڑ رہی تھی ہر طرف
سمندروں کے پار سے
بلا رہی تھی اک صدا
میں اِس صدا سے بھاگ کر
اِس اجنبی دیار میں
پناہ لینے آیا تھا

تمہارے شہر میں....!

عمارتوں کی بلندی کا راز دار ہوں میں
کشادہ سڑکوں کی دوری مری نگاہ میں ہے
عظیم شہر کی ہر چیز مجھ پہ روشن ہے
عظیم شہر میں ہیں ان گنت مرے احباب
یہ جگمگاتا نگر مجھکو ایسا لگتا ہے
کہ جیسے میرا وطن اور میرا گھر ہو یہی
مگر میں پھر بھی یہاں اجنبی سا لگتا ہوں
تمہارے شہر میں میں اجنبی سا لگتا ہوں

غزل

ہزاروں سال سے میں جس کے انتظار میں تھا
وہ عکسِ خواب تو میرے ہی اختیار میں تھا

وہ میری ذات کے پرتو سے ماہتاب ہوا
وگرنہ کرّۂ بے نور کس شمار میں تھا

ہرے شجر سے مجھے اب کوئی لگاؤ نہ تھا
میں برگِ خشک تھا اڑتے ہوئے غبار میں تھا

لباسِ روح سے دھاگے الگ نہ کر پایا
مرا وجود تو پنہاں ہر ایک تار میں تھا

میں بدگماں نہ کبھی اس سے ہو سکا اختر
عجب طرح کا مزہ اس کے جھوٹے پیار میں تھا

غزل

ورقِ دل پہ کوئی نقش بنایا ہوتا
اس کے رنگوں سے پھر اس کو سجایا ہوتا

میں کہ دریا تھا سمندر سے مجھے ملنا تھا
غم کا صحرا مرے رستہ میں نہ آیا ہوتا

ٹوٹنا اور بکھرنا تو مقدر تھا مرا
کاش تو نے مجھے جوڑے میں لگایا ہوتا

نام جس کا میں درختوں پہ لکھا کرتا تھا
کاش ملنے وہ کبھی خواب میں آیا ہوتا

وسعتِ دامنِ صحرا پہ میں چھا جاتا اگر
اپنے ہاتھوں سے مجھے اس نے جلایا ہوتا

خود بھی رسوا ہوا اور مجھ کو بھی بدنام کیا
میں ترا راز تھا سینہ میں چھپایا ہوتا

جنسِ نایاب ہوں رستہ میں پڑا ہوں اختر
ڈھونڈنے کوئی تو مجھکو یہاں آیا ہوتا

پرانے خواب

ٹوٹے قصے ٹوٹی باتیں
جوڑ رہی ہے کالی رات
آج کوئی ہمراز نہیں ہے
آج کوئی بھی پاس نہیں ہے
پچھلے جنم میں جن خوابوں کو
ممی بنا کر
یادوں کے اہرام میں میں نے
دفن کیا تھا
وہی پرانے خواب
مانگ رہی ہیں
میری آنکھیں
کس سے کہوں میں کس کو بتاؤں
آج کوئی بھی پاس نہیں ہے

واپسی کا المیہ

وہی گلیاں وہی کوچے
وہی منظر وہی چہرے
وہی احباب کی چہلیں
وہی جمگھٹ عزیزوں کا
وہی سڑکیں وہی شامیں
وہی قصے وہی باتیں
مگر اب وہ نظر آتی نہیں مجھکو
وہ پاگل مدبھری خوشبو
سمندر پار سے آیا ہوں میں جس کے لیے اختر
وہ پاگل مدبھری خوشبو کہ جس کا نام لکھا تھا

کبھی گھر کے در و دیوار پر میں نے
مرے گھر کے در و دیوار کی زینت
ابھی تک نام ہے اس کا
وہ پاگل مد بھری خوشبو نظر آتی نہیں مجھکو
دھنک اب آسماں پر کیوں نظر آتی نہیں کوئی
ہوا کیوں اب نویدِ جانفزا لاتی نہیں کوئی

غزل

دلِ برباد کو چھوٹا سا مکاں بھی دے گا
جب نیا زخم بھرے گا تو نشاں بھی دے گا

پہلے گزروں گا میں امید و یقیں کی رہ سے
پھر ترا پیار مجھے وہم و گماں بھی دے گا

کوہِ جامد کہ جو لگتا ہے قلندر کی طرح
آبشاروں کو یہی عزمِ جواں بھی دے گا

پیکرِ رنگ جو پل بھر میں بکھر جائے گا
جاگتی آنکھوں کو خوابوں کا جہاں بھی دے گا

تم جلانا مجھے چاہو تو جلا دو لیکن
نخلِ تازہ جو جلے گا تو دھواں بھی دے گا

وقت دیتا ہے جنھیں آج کھلونے اخترؔ
انھیں اطفال کو کل تیر و سناں بھی دے گا

غزل

تھوڑے دن میں سڑ جائے گا
بہتا پانی ٹھہر گیا ہے

نام لکھا تھا جس پہ تمہارا
پیڑ وہ جل کر راکھ ہوا ہے

پیار کے موتی بکھرے پڑے ہیں
آس کا دھاگا ٹوٹ گیا ہے

آپ کی آنکھیں یہ کہتی ہیں
آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے

دیکھو کہاں لے جائے ہوا اب
شاخ سے پتہ ٹوٹ گیا ہے

لکیریں

ہاتھ کی ریکھا
اک ہوٹل کا نام نہیں ہے
ریکھاؤں کے جال سے بچنا
بڑا کٹھن ہے
یہی لکیریں حدیں بنیں گی
یہی لکیریں بنیں گی راہیں
قرب تمہارے بدن کا ساتھی
ہاتھ کی ریکھاؤں جیسا ہے

پرانے خدا کی دیرینہ خواہش

سنو اے لوگو
کہ میں نے تم کو حیات بخشی
تمہاری خاطر زمیں بنائی
زمیں کے اوپر فلک بنایا
تمہارے دل کو سکون بخشا
تمہارے سونے کو شب بنائی
سنو اے لوگو
تمہاری خاطر وہ شے بنائی
کہ جو تمہاری حیات کا
ماحصل بنی ہے
تمہیں خبر ہے
کہ میرے دل میں
یہ آرزو ہے

کہیں کبھی اک دن فلک سے اتروں
زمیں پہ آؤں
تمہارے بچّوں کے ساتھ کھیلوں
تمہاری ماؤں کا دودھ پی لوں
تمہاری رقص و سرود کی محفلوں میں بھی
شریک ہو کر
کسی حسینہ کے ساتھ ناچوں
کسی مغنی کے ساتھ گاؤں
سنو اے لوگو
مجھے بھی مینا و جام دیدو
مجھے بھی اچھا سا نام دیدو

غزل

مری حیات کو یہ ربط باب رہنے دے
ورق ورق یوں ہی غم کی کتاب رہنے دے

تباہ خود کو میں کر لوں بدن کو چھو کے ترے
تو اپنے لمس کا مجھ پر عذاب رہنے دے

میں راہ گیروں کی ہمّت بندھانے والا ہوں
مرے وجود میں شامل سراب رہنے دے

گزرنے والے مسافر ہیں تو ٹھہریں گے
کھلا تو دل کی سرائے کا باب رہنے دے

ذرا ٹھہر کہ ابھی خون میں سمائی نہیں!
مرے قریب بدن کی شراب رہنے دے

بسا لوں آنکھوں میں اپنی میں عکسِ خواب کئی
نگارِ شب کو ابھی بے حجاب رہنے دے

بھلا چکا ہوں میں سب کچھ دلا نہ یاد مجھے
جو کھو چکا ہوں اب اس کا حساب رہنے دے

غزل

گو چاہتا تھا بہت پر یہ مجھ سے ہو نہ سکا
میں ارضِ دل میں محبت کا بیج بو نہ سکا

بھنور میں یوں تو مری ناؤ بارہا آئی
مگر ہوس کا سمندر مجھے ڈبو نہ سکا

صدائے گنبدِ بے در ہوں قید ہوں کب سے
میں اپنے آپ میں کوئی صدا سمو نہ سکا

میں ماہ و سال کے ریشم سے نرم دھاگے میں
تمہاری یاد کے موتی کبھی پرو نہ سکا

بچھڑتے وقت وہ رویا لپٹ کے مجھ سے بہت
عجب ستم ہے کہ میں پھر کبھی کھل کے رو نہ سکا

عجیب شور اٹھا تھا ہوس کے دریا میں
مگر میں شور میں آواز اپنی کھو نہ سکا

بہت سے یوں تو مجھے ہم سفر ملے اختؔر
مگر کوئی کبھی مرے غم کا بوجھ ڈھو نہ سکا

بیڈ ۱۲

نام نہیں ہے میرا کوئی
میرا نمبر بارہ ہے
نام نہیں ہے میرا کوئی

میرے پڑوسی سے ملنے
آتے رہتے ہیں کچھ لوگ
جھوٹی تسلّی دے جاتے ہیں
کاش یہاں پر
مجھسے ملنے کوئی نہ آئے

کمرہ سے باہر کیا ہے
اس کی مجھکو خبر نہیں ہے
دنیا کی مجھکو خبر نہیں ہے

لیکن اتنا مجھکو پتہ ہے
روگ نہیں ہے کوئی مجھکو
شاید میں انسان نہیں ہوں
میرا کوئی نام نہیں ہے
میرا نمبر بارہ ہے
کاش یہاں پر مجھ سے ملنے
کوئی نہ آئے

غزل

ہوس کا شیشۂ نازک ہوں پھوٹ جاؤں گا
نہ مار کھینچ کے اس طرح سنگِ یاس مجھے
میں نیند میں کبھی دیوار و در کی رہ نہ سکا
نہ آسکا کبھی شہروں کا رنگ راس مجھے
گرے گا ٹوٹ کے سر پر یہ آسمان کبھی
ڈرائے رکھتا ہے ہر دم مرا قیاس مجھے
مرے بدن میں چھپا ہے سمندروں کا فسوں
جلا سکے گی بھلا کیا یہ خشک گھاس مجھے
جھلس رہا ہوں میں صدیوں سے غم کے صحرا میں
مگر ہے ابرِ گریزاں کی پھر بھی آس مجھے

ٹوٹ کر چاہے جانے کا غم

رگوں میں رینگتی ہیں چیونٹیوں کی طرح پھر
اداسیاں
بدن کی زرد زرد سی تھکن
پکارتی ہے نیند کو
گئے دنوں کی آگ نے جھلس دیا ہے جسم کو
جھلستی ریت میں کہاں ہے چشمۂ حیات
جھلستی ریت کی طرح
بکھر رہی ہے زندگی
مگر ابھی کہاں ہوا ہے ختم سلسلہ
بکھر بکھر کے پھر
بنیں گے ٹیلے ریت کے
نہیں ہے اب کوئی مکاں

کہ جس میں میں بھی رہ سکوں
تو آنا چاہتی ہے کیوں یہاں
نہیں ہے اب کوئی مکاں
کہ جس میں تجھکو رکھ سکوں

سبھی خیال سرد ہو گئے
سبھی نقوش گرد ہو گئے
نہیں ہے سر پہ آسماں
ہر ایک شے دھواں دھواں
تو پھر بھی چاہتی ہے مجھکو ٹوٹ کر

غزل

ٹھہرے پانی میں یہاں ایک حسین خواب بھی ہے
آس کی جھیل میں عکسِ رُخِ مہتاب بھی ہے

دشتِ احساس کے تپتے ہوئے ویرانے میں
تیری یادوں کا ہے اک پیڑ جو شاداب بھی ہے

پار کرنا بڑا مشکل ہے کہ یہ بحرِ ہوس
کہیں گہرا ہے بہت اور کہیں پایاب بھی ہے

اس کی تصویر میں آنکھوں میں بسالوں کہ یہ شے
لاکھ ارزاں ہی سہی میرے لیے نایاب بھی ہے

یوں تو لگتا ہے سمندر بڑا خاموش مگر
اس کے سینے میں نہاں کرب کا سیلاب بھی ہے

پیاس تم اپنی بجھانے یہاں آئے ہو مگر
یہ کنواں پیار کا گہرا ابھی ہے بے آب بھی ہے

یہ تمناؤں کی سوکھی ہوئی ندی اخترؔ
اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے اک خواب بھی ہے

غزل

گماں کی طرح یقیں بن کے مجھ پہ چھا نہ سکا
وہ شخص آگ تھا لیکن مجھے جلا نہ سکا

ہوا کے دوش پہ اڑتا رہا ہوں یوں تو سدا
حصارِ ذات سے آگے مگر میں جا نہ سکا

اُسے یقیں ہے کہ میں جھک کے چومتا ہوں زمیں
پہاڑ میری بلندی کا راز پا نہ سکا

عبور کر گئے دل کو بڑے سکون سے ہم
عجیب دریا تھا کوئی بھنور بنا نہ سکا

فضائے دشت پہ میں آگ بن کے چھا جاتا
گو چوبِ خشک تھا پھر بھی کوئی جلا نہ سکا

مکانِ دل میں لگی تھی کچھ آگ ہی ایسی
کہ سامنے تھے سبھی اور کوئی بجھا نہ سکا

مرے نقوش تھے زینت سبھی گھروں کی مگر
عجیب بات ہے میں اپنا گھر سجا نہ سکا

نوحہ

دل کی زمیں پر خواہشیں اگتی نہیں
نیلے گگن پر اب کوئی کالی گھٹا چھاتی نہیں
پل میں اجڑ جائیں گی ساری بستیاں
پھیلا ہوا ہے آسماں
غم کی طرح
ہم قحط کے مارے ہوئے جائیں کہاں
کذب و ریا کے شہر میں
کوئی نہیں ہے مہرباں
اب بڑھ گئی ہیں دوریاں
ہم اپنے گھر کو چھوڑ کر
کھیتوں سے ناطہ توڑ کر
کیوں شہر میں جائیں غلامی کے لیے
سب خواب کے سندر محل جل کر ہوئے ہیں خاک اب

شہروں میں اب کوئی نہیں ایسا جسے
بادِ صبا سے پیار ہو
نخلِ صدا سے پیار ہو
بارود نے ہر شہر کو جھلسا دیا
اور بےبسی کی آگ کو بھڑکا دیا
ہم قحط کے مارے ہوئے جائیں کہاں
پھیلا ہوا ہے آسماں
غم کی طرح

راکھ جمنے لگی انگاروں پر

آنکھیں بے خواب ہوئیں
جھیلیں بے آب ہوئیں
کاسۂ دل میں کوئی یاد نہیں
کوئی سوغات نہیں
دستِ خواہش کو میں پھیلاؤں کہاں
خود فراموشی کے اس دور میں مفلس ہیں سبھی
اب مریضوں کو دواؤں کی ضرورت نہ رہی
لاعلاجوں کو دعاؤں کی ضرورت نہ رہی
محفلیں چاند ستاروں کی سجاتے کیوں ہو
چاند کا نور بھی سورج ہی کی خیرات تو ہے
غم تھا اک گوہر نایاب سو تھیر نکلا
اب کوئی درد نہیں درد کا احساس نہیں
اب کوئی پاس نہیں
آتشِ زیست ہوئی جاتی ہے ٹھنڈی دیکھو
راکھ جمنے لگی انگاروں پر

غزل

جو زخم دل پہ لگا ہے وہ بھر نہ جائے کہیں
کتابِ درد ہوا میں بکھر نہ جائے کہیں
بجھی کہاں ہے ابھی پیاس دل کے صحرا کی
چڑھی ہوئی ہے جو ندّی اتر نہ جائے کہیں
ہوا نے اس کو بنایا ہے سرکش و مغرور
پتنگ ڈور سے خود کٹ کے مر نہ جائے کہیں
جھلس رہا ہوں میں خود اپنی آگ میں لیکن
مرے عذاب کی اس تک خبر نہ جائے کہیں
بگاڑ دی ہے مری شکل وقت نے اختر
مجھے وہ دیکھ کے اس طرح ڈر نہ جائے کہیں

غزل

وہ جو کنوئیں میں ڈوبا ہوگا
شاید کوئی پیاسا ہوگا

من کے نگر میں آگ لگی ہے
غم کا دیپک بھڑکا ہوگا

ساری چیزیں بکھری پڑی ہیں
گھر میں کوئی آیا ہوگا

پیار کا جنگل سبز ہوا ہے
غم کا ساون برسا ہوگا

پھولوں پر شبنم کے قطرے
کوئی اختر رویا ہوگا

احمد آباد کی آخری رات

ناگنوں کی طرح
بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر
تیرتے رہتے ہیں
ریشم سے ملائم اجسام
یہ جواں جسم تو نازک ہیں ہواؤں کی طرح
نکہت و رنگ کے یہ شوخ سجیلے پیکر
میری آنکھوں میں نہ بس جائیں
بصارت کی طرح
بلڈنگیں اپنی بلندی پہ بہت نازاں ہیں
روشنی رنگ بدلتی ہے کئی
میری رگ رگ میں یہ سیمابی تڑپ کیسی ہے
دائرہ در دائرہ

رقصاں ہے تمنا کی شراب
یہ جواں رات بڑی ظالم ہے
آج میں شہر کے ہنگاموں میں مر جاؤں گا
لمس کی آگ
مرے دل میں بھڑک اٹھی ہے
ریشمی خواہشیں ہاتھوں سے میں چھو کر دیکھوں
آج گیتوں کو مجسم کر دوں

ذوقِ ناآسودگی

چند بوسیدہ کتابوں کے پریشاں ہوں ورق
آئنہ ٹوٹ کے بکھرا تھا زمیں پر ایسے
میں نے پھر ٹوٹے ہوئے کانچ کے ان ٹکڑوں کو
ایک اک کر کے اٹھایا تھا زمیں سے گویا
یہ مری روح مرے جسم کے ہی ٹکڑے ہوں
کیونکہ اس شیشۂ بلّور کے ہر ٹکڑے میں
میں جھلکتا تھا کہ ہو فلم کوئی پردہ پر
اور پھر شیشۂ بلّور کے ان ٹکڑوں سے
خوابِ امید کا اک نقش بنایا میں نے
رنگ و روغن سے چمکتی تھیں لکیریں اس کی
وہ لکیریں جو حدیں کھینچتی ہیں توڑتی ہیں
میں نے اس نقش سے کمرے کو سجایا گویا

مرے کمرے مری ہستی کا یہی حاصل ہو
اور اک روز پھر اس نقش حسیں کو میں نے
توڑ ڈالا کہ کشش اب نہ رہی تھی اس میں
مجھکو اس کا نہ تو غم تھا نہ پشیمانی تھی
اک نیا نقش بنانے کی تمنا دل میں
نیلے آکاش کی مانند جواں تھی اب بھی

غزل

لکھا تھا ریت پہ جو نام وہ مٹا نہ سکی
یہ موجِ بحرِ ہوس بھی مجھے بہا نہ سکی
ہوا تھی آندھی کی صورت کوئی ٹھہر نہ سکا
مگر پہاڑ سے آندھی مجھے گرا نہ سکی
لبوں کو اس کے جو چوما تو خود ہی سوکھ گئی
عجیب پیاس تھی میری ندی بجھا نہ سکی
گروں گا پیڑ سے اک دن کہ برگِ خشک ہوں میں
ذرا سی بات تھی لیکن سمجھ میں آ نہ سکی
سبھی درخت ہوئے سبز اب کی بارش میں
میں ایسا پیڑ تھا جس پر بہار آ نہ سکی
پڑا تھا ٹوٹ کے ٹھوکریں راہ گیروں کی
میں برگِ خشک تھا لیکن ہوا اڑا نہ سکی

غزل

خیال و خواب کے پیکر بدلتے رہتے ہیں
ہم اپنی آگ میں ہر دم پگھلتے رہتے ہیں
ہمیں ہے ناز کہ ہم ہیں پہاڑ کی مانند
ہماری آنکھوں سے چشمے ابلتے رہتے ہیں
تمہارے واسطے یہ چیز ہے نئی ورنہ
یہاں پہ سانپ تو اکثر نکلتے رہتے ہیں
بلندیوں میں جو اڑتے ہیں ان کو کیا معلوم
گھنے بنوں کی ہیں ہم آگ جلتے رہتے ہیں
تم اپنے جسم کے ملبوس کو بچائے رکھو
غلیظ پانی ہیں ہم تو اچھلتے رہتے ہیں
ہمارے ساتھ کہاں تک چلو گے ضد نہ کرو
کہ راستوں کی طرح ہم تو چلتے رہتے ہیں
بدلتی رت کی طرح ان کے پیار میں ہم بھی
خود اپنی شکل کو ہر دم بدلتے رہتے ہیں

غزل

سر چھپانے کو سائبان کہاں
اب مرے سر پہ آسمان کہاں

ساری گرمی تھی ایک کے دم سے
بال و پر ہیں مگر اڑان کہاں

یوں تو کہنے کو گھر میں رہتے ہیں
وہ ہمارا مگر مکان کہاں

کچھ نہ بولوں گا جو بھی چاہو کہو
منہ میں یارو مرے زبان کہاں

چل پڑی ناؤ جن سہاروں پر
اڑ گئے ہیں وہ بادبان کہاں

پیڑ پر گرد جم گئی تھی کبھی
اس کے باقی ہیں اب نشان کہاں

ہم بلندی کو چھونے والے تھے
سر پہ آکر گری چٹان کہاں

غزل

اس دل میں اک آس تھی پہلے
خشک زمیں پہ گھاس تھی پہلے

آنکھوں کے صحرا میں ہر سو
گیلی گیلی پیاس تھی پہلے

سوکھی ہوئی اس جھیل کے دل میں
اک کنول کی باس تھی پہلے

میں نے آکر اس کو ہنسایا
دنیا کتنی اداس تھی پہلے

اب تو وحشت سی ہوتی ہے
ٹھنڈی ہوا کو راس تھی پہلے

تجھ سے محبت بنی حقیقت
مُردوں کا اتہاس تھی پہلے

نفرت

ہوا کمرے میں آتی ہے
ہوا تو روز آتی ہے
ہوا کا لمس ارزاں ہے
صدا بھی روز آتی ہے
سماعت بھی تو ارزاں ہے
نہ جانے لوگ کیسے ہیں
ہوا سے عشق کرتے ہیں
صدا پر جان دیتے ہیں
مجھے دونوں سے نفرت ہے
کہ میں نے چھو لیا سب کچھ
کہ میں نے سن لیا سب کچھ

خوابوں کا نگر

خوابوں کے ویران نگر میں
پیار کا عالیشان محل ہے
جس میں اب مکڑی کے جالے
پاگل ہو کر
ناچ رہے ہیں

غزل

مجھے حیات کے سانچوں میں ڈھالنے والے
کہاں گئے وہ سمندر کھنگالنے والے

لڑھک رہا ہوں ڈھلانوں سے پیار کی میں تو
نہ آئیں راہ میں، مجھکو سنبھالنے والے

ہمارے شوقِ فراواں نے ڈس لیا ہم کو
کہ آستیں میں تھے ہم سانپ پالنے والے

ہوا میں پھینک نہ مجھکو سمجھ کے کھیل کوئی
تجھی کو آ کے لگوں گا اچھالنے والے

ذرا سا کام ہوں میں پھر بھی نامکمل ہوں
یہاں ملے ہیں سبھی مجھکو ٹالنے والے

کنواں ہوس کا تھا گہرا کچھ اس قدر اختر
کہ خود ہی گر گئے مجھکو نکالنے والے

غزل

شوخ گفتار ہوئی چلبلے مکتوب ہوئے
بے تکلّف وہ ہوئے ہم سے تو پھر خوب ہوئے

دام سے جن کے نکلنا مرا مشکل تھا بہت
آج وہ پہلی ہی یلغار میں مغلوب ہوئے

رہے شوکیس میں جب تک تو نہ پوچھا ہمکو
اور جب بِک گئے ہم تو انھیں مطلوب ہوئے

نقشِ امید کے وہ رنگ جو ہلکے تھے بہت
دلِ ناعاقبت اندیش کو مرغوب ہوئے

سازو آہنگ کے قیدی وہ مہذب شہری
وحشی نغمات کو سن کر بڑے مجذوب ہوئے

جن کے سائے سے کبھی میں دور رہا تھا اخترؔ
ان کے سب جرم مرے نام سے منسوب ہوئے

غزل

زمیں بدلتی رہی آسماں بدلتے رہے
مکیں بدل نہ سکے پر مکاں بدلتے رہے
ہمارے عشق کا محور وہی رہا لیکن
اسے چھپانے کو ہم داستاں بدلتے رہے
کبھی دھوئیں کی تھی چادر کبھی تھا نیل گگن
مکاں وہی تھا مگر سائباں بدلتے رہے
تمہاری یاد کے جنگل سلگتے بجھتے رہے
عجیب چیز تھے یہ بھی سماں بدلتے رہے
بس ایک بات تھی کہنے کو اور کچھ بھی نہ تھا
ہم اس کے واسطے طرزِ بیاں بدلتے رہے
بچھے تھے پیار کے جنگل میں راستے کی طرح
گزرنے والے ہمارے نشاں بدلتے رہے

غزل

اپنی بربادی کا احساس مٹانے دو مجھے
گھر میں جو کچھ بھی بچا ہے وہ جلانے دو مجھے

دل کی دیواروں پہ کیوں نام لکھا ہے اس کا
لوگ پڑھ لیں گے یہ تحریر مٹانے دو مجھے

ہو گی تذلیل جو آوارہ پھریں گے ہر سو
غم کے سوکھے ہوئے پتوں کو جلانے دو مجھے

دولتِ دید کہ رستے میں ملی ہے مجھکو
چھین لے گا کوئی آنکھوں میں چھپانے دو مجھے

اپنی ہی گونج سے ٹکرا کے میں مر جاؤں گا
گنبدِ درد میں آواز لگانے دو مجھے

اس سے پہلے کہ کوئی آ کے چرا لے اختر
دل کی سوغات کو رستے میں لٹانے دو مجھے

غزل

پیار کی گرد اڑاتے ہوئے چلنے والے
ہیں کہاں رنگ فضاؤں کا بدلنے والے

دل کے جنگل میں لگی آگ مگر بجھ بھی گئی
ورنہ کچھ یاد کے پتے بھی تھے جلنے والے

ٹھوکر دل نے ہمیں یاروں کی سرفراز کیا
گیند کی طرح نہ تھے ہم تو اچھلنے والے

یہ الگ بات کہ سورج نہ ادھر سے گذرا
ہم بھی تھے برف کی مانند پگھلنے والے

خیر سمجھو کہ زمیں دل کی نہ غرقاب ہوئی
خواب کے دریا تھے رُخ اپنا بدلنے والے

شہر میں دل کے ہوا پھر نہ چراغاں اخترؔ
ہم بھی پلکوں کی منڈیروں پہ تھے جلنے والے

غزل

(کلاسکی شعرار کی نذر)

ہمارے غم کی رعنائی بس ان کی اک نہیں تک ہے
کہ اس خاتم کی زیبائش گراں قیمت نگیں تک ہے
یہ وہ قطرے نہیں جو گوہرِ نایاب بن جائیں
اِن اشکوں کی رسائی تو ہماری آستیں تک ہے
کھنڈر ہو جائیں گے دیوار و در یہ اس کے جاتے ہی
مکانِ دل کی آرائش اسی کافر مکیں تک ہے
جو نظریں پھیر لیں اس نے تو پھر یہ ٹوٹ جائے گا
نہالِ دل کی شادابی نگاہِ سرمگیں تک ہے
گزرگاہِ حقائق میں ہمارا ساتھ مشکل ہے
جہاں ہے موڑ خوابوں کا ہماری حد وہیں تک ہے
وہ اپنی تمکنت کے راز سے واقف نہیں اختر
کہ مارِ درد کی قیمت بس اک لعلِ حسیں تک ہے

غزل

میری پلکوں کے دریچوں کو سجانے کے لیے
رات آئے گی چراغوں کو جلانے کے لیے
ایسا اُجڑا ہے یہ جنگل کہ بگولے بھی نہیں
اب ہوا آتی نہیں دھول اڑانے کے لیے
خشک مٹی میں یہ ہلکی سی نمی ہے کیسی
کون آیا تھا نشاں چھوڑ کے جانے کے لیے
دل کے ویرانے میں آکر تو صدا ہی کھو دی
ہم تو آئے تھے بہت شور مچانے کے لیے
چھوٹے افسانے بہت ہم نے لکھے ہیں لیکن
اب کوئی یاد نہیں تم کو سنانے کے لیے
خشک دریا کو طلاطم کی ہے خواہش اختر
ریت پر لکھے ہوئے نام مٹانے کے لیے

غزل

دل کے ویرانے میں اک دیپ جلالو اختر
اس خرابے کو پھر اک بار سجالو اختر

دشتِ ویراں میں ملے گا نہ یہ دریا تم کو
آگ جو دل میں لگی ہے وہ بجھالو اختر

آندھیاں وقت کی ہر نقش مٹا جائیں گی
اپنے بچنے کی کوئی راہ نکالو اختر

تم بہت خوش ہو زمانہ یہی سمجھے گا تمہیں
پھول اک کوٹ کے کالر پہ لگالو اختر

اپنی پلکوں پہ ستاروں کو سجانے کے لیے
روٹھ کے جاتی ہوئی شب کو منالو اختر

آواز کا زخم

سورج ابھی جاگا نہ تھا
کھڑکی سے باہر جھانک کر
دیکھا
سڑک پر دور تک
کوئی نہ تھا
چپکے سے اپنی ڈائری میں کھول کر پڑھنے لگا
الفاظ کی معصوم سی تصویر
پھر تنہا مجھے پاکر یکایک ہنس پڑی
کمرے کی ہر دیوار سے
آواز یہ آنے لگی

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں"

میں ڈر گیا
کس نے کہا
یہ کون تھا
پھر ایک دم باہر اجالا ہو گیا
تاریکیاں مجھ سے لپٹ کر
رو پڑیں

زخمی صدا کی موت

اور پھر یوں ہوا
بادلوں سے گھرا آسماں
پربتوں کی اداسی پہ رونے لگا
اور پھر آندھیاں رک گئیں
اور وہ حاملہ
جو بلندی سے نیچے گری تھی ابھی
اس کے زخموں سے بہتا ہوا گرم خوں
سرد مرجھائے پھولوں پہ جمنے لگا
حاملہ کی صدا
ٹسنے والا دہاں
کون تھا
چند لمحے وہ یوں ہی تڑپتی رہی
کوئی آئے اِدھر اس کو دیکھے ذرا

اس کا ساتھی کہاں کھو گیا
وہ کہ جو اس کا دمساز تھا اس کا ہمراز تھا
جس نے اس کو بنایا تھا ماں
خودکشی کا ارادہ تو اس کا نہیں تھا مگر .... !
چند لمحے وہ یوں ہی تڑپتی رہی
اور پھر اس کی زخمی صدا
بھیگے موسم کے برفیلے ماحول میں
گونج کر مر گئی
اور پھر برف گرنے لگی
برف نے
مرنے والی کا ٹھنڈا بدن ڈھک دیا

غزل

پھر جنوں کھلکھلا کر ہنسا ہے
ایک فرزانہ مرنے چلا ہے
دل کی ہنسی کا خاموش نغمہ
غم کی دلکش صدا چاہتا ہے
رات سڑکوں پہ گانے لگی ہے
دُور کُتّا کوئی رو رہا ہے
ایک کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا
دردِ دل کی دوا بن گیا ہے
بادلوں کو ہنسی آ رہی ہے
مور جنگل میں کیوں رو رہا ہے

غزل

راستے کی دھول نے پیروں کو زخمی کر دیا
بحر سے ماہی الگ کرنا مجھے آتا نہیں

بیٹھ جاؤں دو گھڑی آرام سے یار و کہیں
زندگی کے دشت میں ایسا کوئی سایا نہیں

خواب سا سندر بدن تھا بستر کمخواب پر
رات بھر پھر بھی مرے دل نے سکوں پایا نہیں

چھا گئی ہے خامشی کی برف میرے ذہن پر
کلپنا کے دیش میں سورج کبھی مرتا نہیں

نرم جسموں کی خوشی آنکھوں میں بھر کر رات کو
سبزۂ خودرد پہ اخترؔ میں کبھی سویا نہیں

غزل

اگرچہ سپاہی ہوں ہارا ہوا
میں خوش ہوں کہ میں سب سے تنہا لڑا
نئے زخم کی لذتوں کے لیے
کرائے کے گھر میں بدلتا رہا
نئے شہر کی اجنبی راہ میں
نئے خواب کا سلسلہ مل گیا
گگن کے ستارے تو سب بجھ گئے
مگر ایک دل تھا جو جلتا رہا
نہ منزل کا غم تھا نہ مرنے کا ڈر
ہوا سے لپٹ کر میں اُڑتا رہا

سزا

انگارہ بن کے ٹوٹا
اور راکھ بن کے بکھرا
رخشندگی کی ایسی
مجھکو سزا ملے گی
اس کی خبر کہاں تھی

جدّ و جہد

شرابِ محبّت سے سرشار ہو کر
کنارے پہ اک جھیل کے رات کو کل
گگن کے حسیں چاند کے عکس کو میں
پکڑنے کی جدّ و جہد کر رہا تھا

ایک کولاج [له]

قلم کو سیاہی کی حاجت نہیں ہے
کہ لکھ دی ہے ہم نے
ہواؤں کے ماتھے پہ اپنی کہانی
بیتے ہوئے دنوں کی
آواز ڈھونڈتا ہوں
میں بھی ہوں کیسا پاگل
صحرا میں اپنی کھوئی
آواز ڈھونڈتا ہوں
نیل گگن پھر کالا ہوگا
بجھ جائیں گے چاند اور سورج
سفر ہے مقدر
سفر کیا اندھیرے کا ڈر کیا

غبار بن کے ہم اڑے
بکھر گئے۔ بکھر گئے
اٹھو اٹھو۔ غبار بن کے پھر اڑیں
کہ رستہ رستہ بانٹ دیں
غبار ہی غبار ہم
کوئی گیت پرانا سناؤ میاں
کہ یہ رین کٹے
کوئی بیتی کہانی سناؤ میاں
کہ یہ رین کٹے
رات کٹی اور بھور بھئی
بول ری مینا
کچھ تو بول

له Collage.

آخری فاتحہ

(اپنے بھائی کے اچانک انتقال پر)

سڑک پہ بھاگتے ہوئے ہجوم کو
خبر کہاں
کہ آج اک کہانی ختم ہوگئی
وہ بلڈنگیں ہیں بے خبر
جو چھُونا چاہتی ہیں آسمان کو
کہ اِک پہاڑ دھنس گیا زمین میں
لو ڈھک دو اب مزار کو
کہ دیکھ پائیں پھر نہ ہم
کہ سُن نہ پائیں پھر کبھی
وہ حوصلے وہ خواہشیں
جو بن گئیں کہانیاں

نثری نظمیں

گھروندے

ساحل کی ریت سے
اب لہریں ٹکراتی نہیں ہیں
جو ان قدموں کے نشاں
اب اس پر پڑتے نہیں
ریت کو اس کا غم بھی نہیں
اس کو تو
وہ بچّے یاد آتے ہیں
جو گھروندے بنایا کرتے تھے

Cipla

دھوپ
کھڑی تھی باہر
انتظار میں ہمارے
کہ ہمیں جلا کر
کر دے راکھ
لیکن ہم
موت سے بے خبر
چھوٹے سے ریستوراں
"سپلا" میں بیٹھے
دیکھ رہے تھے مستقبل کے خواب
امن و خدمت کی علامت
سفید وردی نے
جب یہ ہمیں بتایا
کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے
تو ہاتھوں سے ہم اس کے

ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے
گلاس لے کر پی گئے
ہم بھاگ کر
دھوپ کے عذاب سے
یہاں آئے تھے
ہم نے اپنے
کان بند کر لیے
اور کھو گئے اپنی باتوں میں
لیکن
دوسرے ٹیبلوں کی پلیٹوں میں
افواہیں کھنکتی رہیں
باہر دھوپ
کھڑی تھی انتظار میں ہمارے
کہ ہمیں جلا کر
کر دے راکھ

مشورہ

اپنا عکس آئینے میں سجاؤ
خواہش کو اپنی اطلسی بستر پہ سلاؤ
کاغذ کے ٹکڑوں سے بازار خرید لاؤ
پاس بک کے ہندسوں کو بڑھاؤ
شور مچاؤ چلاؤ
جو جی میں آئے کر ڈالو
لیکن
وہ شے تلاش نہ کرو
جو موت کی جاگیر ہے
جو زندگی کو نہیں مل سکتی

والدِ مرحوم کی یاد میں

ویران پڑے ہیں مسجد کے دالان
مِٹ گیا قبر کا نشان
ٹھنڈا ہو گیا
گرم کیا ہوا پانی
داڑھی بنانے کے لیے
تانگے والے کی آنکھوں میں انتظار ہوا بوجھل
گھر کے اندر صاحب
کر رہے ہیں تیّاری
باہر جانے کی
گھوڑے کو آنے لگی نیند
سُوکھ گئے کیک

بیکری کے
رتن شاہ پارسی سیٹھ کی ریستوراں میں
جم گیا مِلک شیک
ٹوٹ گیا گلاس
صدیاں بیت گئیں
بیت گئیں صدیاں
شہر ہوا گنجان
مٹ گئے سبھی پرانے نشان

مُسافر

چلچلاتی دُھوپ میں
تم سے ملنے آنے کی سزا یہی ہے
کہ میں اسپتال میں داخل ہو جاؤں
حرارت جو سفر کی تکان ہے
میرے جسم میں
درد بن گئی ہے
یہ حدت تمہاری محبّت کا اشتعال نہیں
میری طبیعت کا اضمحلال ہے
تم اس اضمحلال کو چھونے کی
کوشش نہ کرنا
تم مجھ سے ملنے نہ آنا
کہ میں تو مُسافر ہوں
آج اس اسپتال میں ہوں
کل دوسرے اسپتال میں چلا جاؤں گا

ہجومِ نظارہ میں کھونے سے کیا ہو گا

فراقِ یار کی تصویر
بنی ہے اب
طاقِ نسیاں کی زینت
ہجومِ نظارہ میں کھونے سے کیا ہو گا
چہرے پر دو آنکھیں چپکا کر
رونے سے کیا ہو گا

مرغولے

تیری یاد
سگریٹ کے مرغولوں کی طرح
حلقہ در حلقہ ٹوٹی ہے
پھر پھیل گئی ہے

نیند کی خواہش

کمرے میں تیرتی ہوئی
بلب کی گہری نیلی روشنی
میری آنکھوں میں
کانچ کے ٹکڑوں کی طرح چُبھنے لگی ہے
رات افریقہ کی غیر مہذب حبشن کی طرح
ڈراؤنی ہو گئی ہے
رہ رہ کر کمرہ کا سنّاٹا
چیخ اُٹھتا ہے
ابھی ابھی میں نے
آخری آدھ جلی
سگریٹ کو
اپنے پیر سے مسل دیا ہے
اس کا مسلا ہوا جسم ایسا لگ رہا ہے
جیسے
بھاری ٹرک سے

کوئی مُردار کتّا کچل گیا ہو
تین گھنٹے ہو گئے
خواب آور گولیاں کھائے ہوئے
مگر نہ جانے کیوں
ابھی تک مجھے
نیند نہیں آئی
یہ دوا فروش بھی
بہت بے ایمان ہو گئے ہیں
ریڈیو بند کرو
کیا بکواس گانا ہے
"کوئی لوٹا دے مرے
بیتے ہوئے دن"

جی چاہتا ہے

آج چاند کتنا قریب ہے
جی چاہتا ہے
ہاتھ بڑھا کر
اسے دل میں رکھ لوں
تاکہ
اندھیری راتوں میں
اس کی روشنی
کام آئے

ایک سی دو باتیں

وقت
کسی کا انتظار نہیں کرتا
تیزی سے گذر جاتا ہے
وقت
چھپکلی کی طرح
دیوار پر چپک کر رہ گیا ہے
یہ دونوں باتیں الگ ہیں
پھر بھی ایک سی لگتی ہیں
میں نے ان دونوں باتوں کو

اپنی دو الگ الگ جیبوں میں رکھ لیا ہے
جب یہ دونوں جیب سے
نکل جائیں گی
تب سوچوں گا
زندگی کیا ہے

مجھ کو باہر سے کیا لینا

باہر گرمی بہت ہے
ہو گی
میرا کمرہ تو ٹھنڈا ہے
باہر سردی بہت ہے
ہو گی
میرا کمرہ تو گرم ہے
باہر کالی رات کھڑی ہے
ہو گی
میرے کمرہ کے اندر تو دن کا اجالا پھیل گیا ہے

مجھ کو باہر سے کیا لینا
میں تو اپنے اندر دیکھ رہا ہوں
باطن کو جس نے پہچانا
اس نے سب کچھ جان لیا

بخار

گرمی بہت ہے لیکن تم
اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لو
اور لحاف اوڑھ کر
سو جاؤ
تمہاری تنگ و تاریک گلی میں
اب کوئی نہیں آئے گا
تمہارے تاریک اور پُر عفونت کمرے میں
کوئی نہیں آئے گا
تمہاری خیریت پوچھنے کے لئے
سب مصروف ہیں
اور تم
بیکاری کے بخار سے
پریشان ہو

مایوسی

بکھری چیزوں کو
سمیٹنے سے کیا حاصل
ہوا آئے گی
اور یہ پھر بکھر جائیں گی

لاحاصلی

قطار اندر قطار
انتظار
بے وزن زندگی میں قافیوں کی بھرمار
لاحاصلی کا کیا شمار
سب بیکار
سب بیکار

آسمان

ہماری کھڑکی سے
آسمان نظر آتا ہے
آسمان میں اڑتا ہوا
ہوائی جہاز نظر آتا ہے
ہم ہوائی جہاز کو چھو نہیں سکتے
لیکن دیکھ تو سکتے ہیں
ہماری کھڑکی سے
آسمان نظر آتا ہے

چھوٹے قد کے لوگ

بلند بانگ دعووں کی
آوازیں
کھوٹے سکوں کی طرح
بجتی ہیں
پھر بھی چھوٹے قد کے لوگ
ان قد آور آوازوں کو
سنتے رہتے ہیں
کاغذ کے ٹکڑوں کی
اب کوئی قیمت نہ رہی
پھر بھی بھوکی آنکھیں
انھیں ڈھونڈتی ہیں
اور ناکام رہتی ہیں

اور لمبے بے رحم ہاتھ
انھیں جمع کرتے رہتے ہیں
چھوٹے قد کے لوگ
اپنی آواز کھو چکے ہیں
وہ صرف دیکھ سکتے ہیں
اور سُن سکتے ہیں

اِتنا نہ سوچو

مٹی کے برتن میں
رکھی ہوئی خواہشیں
سڑ گئیں
اب اس برتن کو پھینک دو
کمرے میں چاند سورج
سجانے کا پاگل پن چھوڑ دو
صبح و شام میں فرق کرنا چھوڑ دو
شیشے کو پتھر پر توڑ دو
کیکٹس محبت کا مرض کی طرح بڑھتا ہے
اسے رد کرو

اپنے احساس کو آٹے کی طرح
کیوں گوندھ رہے ہو
اتنا نہ دیکھو
کہ آنکھیں پتھرا جائیں
اتنا نہ سوچو
کہ دماغ ماؤف ہو جائے

فردیات

دیوانۂ خیال فروزاں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں جنگلوں میں چراغاں کئے ہوئے

پرانی فائلوں میں خط تمہارے پڑھ کے روتا ہوں
تمہارے خواب کا جادو یکایک جب ڈراتا ہے

میرے درد کو سمجھی ہوتی
کاش وہ میرے جیسی ہوتی

اس ٹین کے ڈبّے میں اب کچھ بھی نہیں باقی
اک کھوٹی چونّی ہے اکثر جو کھنکتی ہے

وہسکی کا نشہ ذہن پہ چھایا ہے کچھ ایسا
دیہات کی ہم اپنے چلم بھول گئے ہیں

پی. کے. پبلیکیشنز کے شائع کردہ

کچھ اور شعری مجموعے

شیرازہ: آزادی کے بعد کی شاعری کا سب سے بڑا انتخاب ۔ سوا دو سو سے زیادہ مشہور و معروف شاعروں کا منتخب کلام، سوانحی اشاروں کے ساتھ

مرتبین: مخمور سعیدی، پریم گوپال متل۔ **قیمت:** بارہ روپے

آواز کا جسم: مخمور سعیدی کی نظمیں اور غزلیں، جن سے جدید شاعری کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ **قیمت:** دس روپے

سیہ بر سفید: مخمور سعیدی کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نیا ایڈیشن نئی نظموں کے اضافے کے ساتھ۔ **قیمت:** چھ روپے

دلاس یاترا: کمار پاشی کی طویل نظم جو ایک اچھوتی معنویت کی حامل ہے۔ **قیمت:** دس روپے

انتظار کی رات: کمار پاشی کا تازہ ترین کلام جو اردو شاعری کی نئی جہتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ **قیمت:** چھ روپے

خرابہ: نظم و غزل کے صاحبِ طرز شاعر من موہن تلخ کا تازہ مجموعۂ کلام **قیمت:** دس روپے

صریرِ خامہ: مظفر حنفی کی تازہ ترین غزلیں جن میں اُن کے اسلوب کا تیکھا پن عروج پر ہے۔ **قیمت:** چھ روپے

نامہ بر نامہ: رضا نقوی واہی کے منظوم خطوط، ادیبوں، شاعروں اور دوسری اہم شخصیتوں کے نام۔ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا شعری مجموعہ۔ ترتیب: پریم گوپال متل۔ قیمت: چھ روپے۔